''انارکلی''اور ''چچا چھکّن'' کے خالق: امتیاز علی تاج

[1]ڈاکٹر قمر عباس [2]ڈاکٹر یاسمین سلطانہ

Abstract:

Syed Mumtaz Ali and Imtiaz Ali Taj ,the father and son played an important role to promote Urdu literature in the masses. Mumtaz Ali got the education from distinguished personalities, among them was ,Muhammad Hussain Azad, an extraordinary person, who influenced so much upon him, resulting a compilation of book having spiritual stuff. Sir Syed Ahmad Khan, a reformist and enlightened person, was his contemporary and by following his famous magazine "Tehzibul Akhlaque" Mumtaz Ali launched a magazine named "Tehzeeb e Niswan" that created awareness in women circle regarding their rights. He also started publishing a magazine for children named "Phool." He spent his entire life for the promotion of knowledge and wisdom in the society. His wife Muhammadi Begum provided every needed assistance to his husband. She was also a writer and contributed much on literary horizon. His son Imtiaz Ali Taj followed the footprints of his parents and gifted a lot to Urdu literature. He created an immortal comic character named "Chacha Chakkan" which was highly appreciated by readers and critics as well. Another milestone in Urdu literature is a marvelous drama ""Anarkali"" that is still considered as masterpiece . Taj 's wife Hijab Imtiaz was also a prolific writer and produced quality content for readers.

Keywords: **Syed Imtiaz Ali Taj, Heroes, Characters, Urdu Drama, Humor, Tehzib e Niswan, Anar Kali, Chacha Chakan, Monthly Phool.**

کلیدی الفاظ : سید امتیاز علی تاج، تہذیبِ نسواں، ماہنامہ پھول، مزاحیہ کردار، چچا چھکن، اردو ڈراما، انارکلی

---

1 ایسوسی ایٹ پروفیسر، علمہ یونی ورسٹی، کراچی

2 luqooraf، ایسوسی ایٹ پروفیسر، علمہ یونی ورسٹی، کراچی

''چچا چھکّن''کا نام آتے ہی اُردو ادب کے شائقین کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑنے لگتی ہے۔ کون ہیں یہ چچا چھکّن؟ کس نے اُنھیں تخلیق کیا؟ ایک زمانہ گزر جانے کے باوجود بھی لوگ آج چچا چھکّن کو کیوں یاد کرتے ہیں؟ آیئے ان سوالات کے جوابات تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سب سے پہلا سوال ''کون ہیں یہ چچا چھکّن؟''تو اس کا سادہ سا جواب ہے ''ایک مزاحیہ افسانوی کردار''۔ ''افسانوی کردار''میں ''مزاحیہ''کا سابقہ بتاتا ہے کہ عمومی طور پر مزاحیہ کرداروں کی پسندیدگی زیادہ ہوتی ہے، کیوں کہ مزاحیہ کردار لوگوں کے چہرے پر ہنسی لے کر آتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے تحریر کیا ہے:

> ''ہنسی نہ صرف افراد کو باہم مربوط ہونے کی ترغیب دیتی ہے بلکہ ہر اُس شخص کو نشانۂ تمسخر بھی بناتی ہے جو سوسائٹی کے مروّجہ قواعد و ضوابط سے انحراف کرتا ہے۔ چناں چہ مزاحیہ کردار صرف اس لیے مزاحیہ نظر آتا ہے کہ اس سے بعض ایسی حماقتیں سرزد ہوتی ہیں جن سے سوسائٹی کے دوسرے افراد محظوظ ہوتے ہیں۔''(۱)

ڈاکٹر رؤف پاریکھ کے مطابق:

> ''کسی بھی زبان کے ادب میں اعلیٰ درجے کا مزاح اُس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا جب تک اُس زبان کے بولنے والے اپنے ماحول کی خصوصیات اور تضادات اور اپنے سماج کے بارے میں اتنا شعور اور آگہی حاصل نہ کر لیں کہ اس کی کمزوریوں اور ناہمواریوں سے محظوظ ہو سکیں۔''(۲)

مزاحیہ کرداروں کی پسندیدگی کی ایک اور وجہ یہ بھی ہوتی ہیکہ لوگ زندگی میں تفریح کو ضروری سمجھتے ہیں اور جو کردار اُن کے لیے تفریح پیدا کرنے کا باعث بن رہے ہوں، اُنھیں وہ جلد اور زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ ''چچا چھکّن''اُردو کا اوّلین مزاحیہ کردار ہے۔ ''خوجی''(رتن ناتھ سرشار) اور ''حاجی بغلول''(منشی سجّاد حسین، مُدیر اودھ پنچ) کی مثالیں بھی ہمارے سامنے موجود ہیں۔ تاہم، ''چچا چھکّن''کا کردار ناقدین کے نزدیک اُردو ادب کا بہت حد تک مکمل ترین مزاحیہ کردار ہے۔ اب ہم ''کس نے اُنھیں تخلیق کیا''کے سوال کی جانب بڑھتے ہیں۔ اس ''مزاحیہ ترین کردار''کے خالق تھے سیّد امتیاز علی تاج۔ انتہائی

دلچسپ بات یہ ہے کہ اُن کو اُردو ادب میں جس تحریر نے لازوال مقام کا حامل بنایا، وہ ہے ڈراما ''انار کلی''۔ ناممکن ہے کہ اُردو ڈراموں کا ذکر ہو اور ''انار کلی'' کی بات نہ کی جائے۔ایک ناقد کے بقول:

''ڈراما انار کلی کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فنی اعتبار سے ایک مکمل ڈراما ہے۔''(۳)

یوں امتیاز علی تاج وہ خوش قسمت مصنّف ٹھہرے کہ جنھوں نے ایک کردار اور ایک ڈرامے کو لازوال بنا دیا۔ تیسرا سوال کہ کیوں لوگ آج بھی چچا چھکن کو یاد کرتے ہیں تو شاید اس کا جواب بھی بے حد آسان ہے کہ یہ ایک ایسا کردار بن گیا کہ جس کا نام لیتے ہی کسی مخبوط الحواس شخص کی تصویر نگاہوں میں گھومنے لگتی ہے۔اکتوبر ۱۹۰۰ میں لاہور میں پیدا ہونے والے امتیاز علی تاج کو ادب سے لگاؤ ماں اور باپ دونوں سے ملا۔اُن کے والد سیّد ممتاز علی ایک صاحبِ علم اور نامور انسان تھے۔ ۱۸۶۰ میں راولپنڈی میں پیدا ہونے والے شمس العلماء سیّد ممتاز علی کی ابتدائی تعلیم و تربیت قدیم طرز پر ہوئی۔اُن کے والد مولوی سیّد ذوالفقار علی حکومتِ پنجاب میں سرکاری ملازمت سے وابستہ ہونے کے علاوہ ایک صاحبِ علم انسان تھے۔ فارسی ادبیات کی تحصیل نامور عالم اور ادیب، مولانا امام بخش صہبائی سے کی، جو قدیم دہلی کالج کے اساتذہ میں شامل ہونے کے علاوہ دہلی کی تاریخ اور آثار سے گہرے طور پر واقف تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ سر سیّد نے دہلی کے تاریخی آثار پر اپنی مرتّب کردہ کتاب ''آثار الصنادید'' میں صہبائی سے مسلسل مشاورت جاری رکھی۔ خود صہبائی کے علمی و ادبی کارنامے بھی ایک تفصیلی تجزیے کے متقاضی ہیں۔ بہر حال یہ مولوی سیّد ذوالفقار علی ہی کی تربیت اور اثر تھا کہ سیّد ممتاز علی کو بھی ابتدائی عمُر ہی سے علم و ادب سے لگاؤ پیدا ہو چلا۔ مکتبی تعلیم کے دوران سیّد ممتاز علی کو مولانا قاسم نانوتوی کی شاگردی اختیار کرنے کا بھی موقع ملا، جہاں سے اُن کے دینی خیالات پُختگی کی منزلوں تک پہنچے۔ تاہم آگے چل کر اُن کے خیالات میں کسی حد تک تبدیلی کا عمل بھی رُونما ہوا۔ تحصیلِ علم کے دوران مولانا محمد حسین آزادؔ کے شاگرد بھی رہے، سو اُن سے ممکنہ حد تک کسبِ علم و ادب کیا۔ اُن ہی کی صحبت کا اثر تھا کہ روحانی مسائل و معاملات سے حد درجہ شغف پیدا ہوا اور وہ گھنٹوں مولانا آزاد کے ساتھ ان عنوانات پر مباحث کرتے۔ شاید یہ اُسی کا سبب تھا کہ اُنھوں نے نہ صرف یہ کہ اس موضوع پر ڈھیروں کُتب پڑھ ڈالیں بلکہ ایک مغربی ملک سے

تعلق رکھنے والے سیّاح کے مشرقی ملک میں کیے جانے والے سفر اور وہاں ہونے والے روحانی تجربات کو ایک کتابی شکل میں پیش کیا اور جو سیّد ممتاز علی کو اس حد تک پسند آیا کہ اُس کا اُردو ترجمہ ''شیخ حسن'' کے عنوان سے تحریر کیا۔ کتاب کے دیباچے میں امتیاز علی تاج نے لکھا ہے:

> ''والد ماجد اور پروفیسر محمد حسین آزاد) مرحوم کے درمیان روحانیات کے دقیق مسائل ہر دلچسپ گفتگوئیں ہوا کرتی تھیں اور اسی کا اثر تھا کہ والد ماجد کو روحانیات کے متعلق تصنیف کا شوق ہوا۔''(۴)

اب اُنھوں نے بھرپور طریقے سے عملی زندگی میں قدم رکھا۔ ابتدا میں لاہور ہائی کورٹ سے بطور مترجم وابستہ رہے۔ تاہم جلد ہی ملازمت ترک کر کے نشر و اشاعت کے کاموں میں دلچسپی لینے لگے۔ کچھ اور وقت گزرا تو سیّد ممتاز علی نے ہندوستان میں علم و ادب کے فروغ کے لیے ''دارالاشاعت پنجاب'' کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ بھی قائم کر لیا۔ اس کے علاوہ رفاہِ عام پریس کی بنیاد بھی رکھی۔ ادیب و صحافی ہونے کے ساتھ وہ مذہب سے بھی لگاؤ رکھتے تھے۔ ۱۸۹۷ء میں اُن کی دوسری شادی ہوئی، کیوں کہ اُن کی پہلی بیوی کچھ عرصہ قبل وفات پا چکی تھیں، جن سے دو بچّے بھی تھے۔ اُن کی شریکِ حیات محمدی بیگم کی ولادت ۱۸۷۸ء میں شاہ پور، پنجاب میں ہوئی تھی۔ اُن کے والد مولوی احمد شفیع وزیر آباد ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ محمدی بیگم کی عمُر محض تین ہی برس کی تھی کہ اُن کی والدہ انتقال کر گئیں۔ والد نے کچھ وقت بعد دوسری شادی کی۔ یوں محمدی بیگم کو سنِ شعور تک سوتیلی ماں کی پرورش میں رہنا پڑا۔ صوم و صلوٰۃ کی پابندی کیے جانے والے دیں دار گھرانے میں محمدی بیگم کی تربیت بھی مشرقی تہذیب پر پوری طرح گامزن رہنے والی ایک باپردہ اور شرعی معاملات کو بخوبی سمجھنے والی لڑکی کے طور پر ہوئی، تاہم باپ نے یہ التزام ضرور برتا کہ بیٹی کی تعلیم میں کوئی رکاوٹ نہ آنے پائے۔ دینی تعلیم کے ساتھ اُردو زبان و ادب کی تعلیم پر بھی خاص توجہ مرکوز کی گئی۔ اُن کی بڑی بہن احمدی بیگم بیاہ کر دوسرے گھر جا چکی تھیں۔ محمدی بیگم نے اپنی بہن کو خطوط لکھنے شروع کیے اور یہ ایک طرح سے اُن کے ادبی سفر کا آغاز تھا۔ بہت جلد محمدی بیگم نے نہ صرف یہ کہ اُردو پر دسترس حاصل کر لی، بلکہ انگریزی زبان سے

واقفیت کی بھی کسی حد تک حامل ہو چلیں۔ سیّد ممتاز علی کی صحبت میں کام کر کے محمدی بیگم کو علمی طور پر بہت فائدہ ہوا۔ شوہر نے بیوی کی مزید تعلیم کے لیے ایک خاتون انگریزی اتالیق کا بندوبست کیا۔ یہی نہیں، اپنی بیوی کو کاروباری اُمور میں طاق کرنے اور اپنا کاروبار اپنی بیوی کو سونپنے کے لیے ایک ایسے نوجوان کی خدمات حاصل کیں، جو ریاضی میں طاق تھا۔ یوں محمدی بیگم کو حساب کتاب میں بھی مہارت حاصل ہو چلی۔ اب وہ عربی، فارسی، ہندی، انگریزی زبانوں کو صحیح طور پر سمجھنے والی خاتون تھیں۔ سر سیّد احمد خاں کے افکار و کردار سے متاثر سیّد ممتاز علی سماجی بہتری کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ رکھتے تھے۔ تاہم وہ یہ بات جانتے تھے کہ وہ اُس جذبے کی تکمیل محض قلم ہی سے کر سکیں گے۔ اسی کے اتھ اُن کے دل میں یہ بھی خیال تھا کہ خواتین کے حقوق اور اُنھیں بہتر آگاہی دینے کے لیے بھی کچھ نہ کچھ ضرور کیا جانا چاہیے، چناں چہ اُنھوں نے تمام عوامل پر غور کرنے کے بعد خواتین کے لیے ایک پرچہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا اور یوں ۱۸۹۸ء میں اُنھوں نے ''تہذیبِ نسواں'' کے نام سے ایک ہفت روزہ پرچے کا اجراء کیا۔ اگرچہ ایسا ہرگز نہیں تھا کہ خواتین کے لیے ''تہذیبِ نسواں'' سے پیشتر کوئی جریدہ جاری نہیں ہوا تھا۔ محققین کے مطابق ''رفیقِ نسواں'' اُردو کا ایسا اوّلین پرچہ تھا جو محض خواتین کے سلسلے میں مرتّب کیا گیا تھا۔ یہ ۱۸۸۴ء میں لکھنوء سے جاری ہوا۔ Isabella Thoubourn اس کی مُدیر تھیں۔ اس کے بعد ''اخبار النساء'' جاری ہوا۔ اس کے پیچھے ایک غیر معمولی شخصیت سیّد احمد دہلوی ''صاحبِ فرہنگِ آصفیہ'' تھی۔ یہ رسالہ بھی مذکورہ سال ہی جاری ہوا۔ ان دو پرچوں کے بعد سامنے آنے والا پرچہ ''شریف بیبیاں'' تھا، جسے مولوی محبوب عالم نے ۱۸۹۳ء میں جاری کیا۔ تاہم یہ ضرور تھا کہ سیّد ممتاز علی کے پرچے نے خواتین کے ایک حلقے میں دھیرے دھیرے شعور وہ آگہی بیدار کی۔ یہ گویا سر سیّد کے افکار و خیالات سے متاثّر ہونے والے سیّد ممتاز علی کا سر سّید سے مزید ایک قدم آگے جانے کا عمل تھا کہ سر سیّد کی بنیادی توجہ مسلمان مردوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کی جانب تھی، جب کہ ''تہذیبِ نسواں'' کا مقصد اُولیٰ یہ تھا کہ تمام دن گھر کی چار دیواری میں قید اُن خواتین کے حقوق کی بات کی

جائے کہ جن کو بیرونی دنیا سے کسی قسم کا کوئی علاقہ نہ تھا۔ یہ گویا ''تہذیبِ نسواں'' کے پردے میں ''حقوقِ نسواں'' کی تحریک تھی۔امداد صابری کے مطابق:

''اس اخبار نے ۵۱ سال ۱۹۴۹ء تک عورتوں کی بہبودگی واصلاح کے لیے کوشش کی۔''(۵)

اس عنوان سے برطانیہ میں شائع ہونے والے اپنے تحقیقی مقالے '' Modern Asian Studies''میں Gail Mineault ایک دلچسپ واقعے کے بیان کے طور پر کچھ یوں رقم طراز ہیں کہ ''۱۸۹۰ء کے اختتام کے قریب سیّد ممتاز علی نے علی گڑھ کا دورہ کیا اور سر سیّد احمد خاں کو اسلامی قوانین میں خواتین کے حقوق سے متعلق اپنے زیرِ ترتیب رسالے کا مسودہ پیش کیا۔ سر سیّد نے جیسے ہی اس کا مطالعہ شروع کیا، اُن کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ مسودے کو درمیان سے پڑھنا شروع کیا تو چہرے پر غصّے کی علامات ظاہر ہوئیں۔ تیسری مرتبہ مسودہ کسی اور مقام سے ملاحظہ کرنے کے بعد تو وہ گویا طیش میں آگئے اور اسی عالم میں مسودے کو پھاڑ کر ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ خوش قسمتی سے عین اُسی وقت ایک ملازم نے آکر ظہرانے میں شرکت کا اعلان کیا۔ سر سیّد کے اپنے دفتر سے طعام گاہ کی طرف جاتے ہی سیّد ممتاز علی نے جھپٹ کر ردّی کی ٹوکری سے مسودہ نکال کر اپنی تحویل میں لے لیا۔ یہاں تک کہ اُنھوں نے ''تہذیبِ نسواں'' کی اشاعت کے لیے ۱۸۹۸ء تک یعنی سر سیّد کے رحلت کر جانے کے سال تک انتظار کیا۔'' واقعے کی صحت اور عدم صحت میں جائے بغیر یہ بیان کرنا البتہ ضروری ہے کہ سر سیّد کا انتقال ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو ہوا اور ''تہذیبِ نسواں'' کا اوّلین شمارہ جولائی ۱۸۹۸ء میں سامنے آیا۔ رسالے کے قلمی معاونین میں آگے چل کر نامور ہستیاں شامل ہوئیں، جن میں حسرتؔ موہانی، مولانا الطاف حسین حالیؔ اور علامہ اقبالؔ جیسے دُوربین و جہاندیدہ افراد بھی تھے۔ سیّد ممتاز علی نے محض رسمی طور پر ہی خواتین کے حقوق کی بات نہ کی بلکہ ''تہذیبِ نسواں'' کے مُدیر کا عہدہ اپنی شریکِ حیات کو دے کر ثابت کیا کہ وہ دل سے خواتین کے حقوق کے قائل ہیں۔ رسالے کی کامیابی اور شہرت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے اپنی اشاعت کی نصف صدی مکمل کی۔ محمدی بیگم نے ماؤں کی رہنمائی کے لیے ۱۹۰۵ء میں ''مشیرِ مادر'' کے عنوان سے ایک رسالے کا اجراء بھی کیا ''رفیقِ عروس''، ''حیاتِ اشرف''،

'' بچّے موتی''، ''سگھڑ بیٹی''، ''نعمت خانہ''''دل پسند کہانیاں''، ''تاج پھول''، ''شریف بیٹی'' وغیران کی دیگر تخلیقی کاوشیں ہیں۔آخرالذکر ناول کے بارے میں ایک محقّق کا کہنا ہے :

> ''اُن کے دوسرے ناول ''شریف بیٹی'' کوپڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فطرت انسانی سے خاصی واقف تھیں اوراسے ناول میں پیش کرنے کا سلیقہ اُنھیں معلوم تھا۔''(۶)

محمدی بیگم ۱۹۰۸ء میں انتقال کر گئیں۔ سیّد ممتاز علی انتھک کام کرنے والے انسانوں میں سے تھے۔ اُنھوں نے اس بات پر بھی غور وخوض کرنا شروع کیا کہ بچّوں کی ذہنی نشوونما کے لیے بھی کسی پرچے کا جاری ہونا کس حد تک مُفید ہو سکتا ہے اور بالآخراس نتیجے تک پہنچے کہ ایسا کرنا بہتری کی طرف قدم بڑھانا ہوگا۔جب یہ فیصلہ ہو گیا تو اب سوچا جانے لگا کہ رسالے کا اچھا سا نام بھی ہونا چاہیے۔کیوں کہ رسالہ پھول جیسے بچّوں کے لیے ترتیب دیا جاناتھا، لہٰذااس کا نام ''پھول''ہی رکھ دیا گیا۔یہ رسالہ ۱۹۰۹ء میں جاری کیا گیا۔زندگی کسی مقصدِ اعلیٰ کے تحت گزارنا گویا سیّد ممتاز علی کی سرشت میں شامل تھا۔یوں وہ اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے تن من دھن سے لگے رہے۔رسالے جاری کیے۔اپنی اہلیہ کے ساتھ مل کر تعلیم وترقیِ نسواں میں ہمہ وقت مصروف رہے۔تعلیمی ادارے کی بنیاد رکھی۔چند علمی وادبی مجالس اور ٹیکسٹ بُک کمیٹی کے رکن رہے۔نصابی کُتب نہ صرف یہ کہ تصنیف کیں بلکہ دیگر عالم وفاضل اشخاص کو لکھنے کی تحریک دے کر شائع کرائیں۔''دارالاشاعت پنجاب'' کو ایک ادبی درس گاہ کی حیثیت عطا کر دی۔غرض یہ کہ زندگی کا ہر ہر لمحہ سیّد ممتاز علی کو سماج کا ایک ممتاز شخص ثابت کرتا رہا۔ممتاز علی ۱۹۳۵ء میں انتقال کر گئے۔خود امتیاز علی تاج ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۰ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔امتیاز علی کو اُن کی والدہ پیار سے تاج کہا کرتیں۔یوں امتیاز علی نے آگے چل کر اسے نام کا حصّہ ہی بنا لیا اور ادب میں امتیاز علی تاج کے نام سے زندہ جاوید قرار پائے۔امتیاز کے ایک بھائی حمید علی بھی تھے۔امتیاز جب عمُر کی نویں منزل پر پہنچے تو باپ نے سالگرہ والے دن ''پھول'' کے عنوان سے اپنے بیٹے کو اپنا ہی ترتیب دیا ہوا بچّوں کا رسالہ بطور تحفہ پیش کیا مقصد محض اپنے بیٹے کے لیے ہی رسالے کا اجراء نہ تھا، بلکہ اس کے ذریعے قوم کے نونہالوں کی ذہنی تربیت تھا۔گورنمنٹ کالج، لاہور سے گریجویشن کرنے کے بعد امتیاز علی تاج نے

انگریزی ادب میں ایم اے کے لیے داخلہ لیا، مگر کچھ وجوہ کی بِنا پر اسے مکمل نہ کر سکے۔ زمانہءِ طالب علمی ہی سے اُنھیں غیر نصابی سر گرمیوں میں بے حد دلچسپی رہتی اور وہ ادب، شاعری، تھیٹر وغیرہ میں خود کو زیادہ پُر سکون محسوس کرتے۔ تخلیق سے کچھ ایسا لگاؤ تھا کہ اپنے خیالات کو مضامین کی شکل میں تحریر کرتے۔ شیکسپیئر کے ڈراموں کو اُردو میں ڈھالنے کا شوق بھی پیدا ہوا۔ ۱۹۱۸ء کا سال تھا اور ابھی عُمر کی اٹھارہویں ہی منزل تھی کہ ''کہکشاں'' کے عنوان سے ایک ماہنامے کا اجراء کیا۔ مولانا عبدالمجید سالک بھی پرچے سے منسلک تھے۔ جلد ہی اس پرچے نے اور اس کے توسط سے امتیاز علی تاج نے ادبی حلقوں میں شناخت قائم کر لی۔ رسالے کے قلمی معاونین میں منشی پریم چند بھی شامل تھے۔ یہ برّصغیر میں زبردست سیاسی انتشار اور خلفشار کا دَور تھا۔ انگریزوں سے آزادی کے لیے ہندوستان بِں کسی نہ کسی وقت اور کہیں نہ کہیں کوئی احتجاج ضرور ہوتا نظر آتا۔ یہ شاید ایسے ہی عوامل کا اثر تھا کہ نوجوان سیّد امتیاز علی تاج نے ۱۹۱۹ء میں کانگریسی رہنما، گاندھی جی کی سوانح عُمری تحریر کی۔ ہندوستان کے سیاسی اُفق پر کانگریس اور مسلم لیگ کا مزاحمتی رنگ نمایاں ہوتا جا رہا تھا۔ اسی کے ساتھ گاندھی اور جناح کے نام بھی قریہ قریہ اور کوچہ کوچہ گردش کرنے لگے تھے۔ ''بھارت سپوت'' کے عنوان سے تحریر کی گئی اس سوانح عُمری کے سرِورق پر تحریر تھا۔ ''بھارت سپوت یعنی مہاتما گاندگی کی سوانح عمری: مرتّبہ سیّد امتیاز علی تاج اڈیٹر رسالہ کہکشاں لاہور''۔ کتاب کا دیباچہ پنڈت موتی لعل نہرو نے تحریر کیا اور جس میں امتیاز علی تاج کے کام کو خوب خوب سراہا۔ اُنھوں نے ''تمہیدی الفاظ'' کے عنوان سے تحریر کیا:

> ''میں نے اس کتاب پر ایک سرسری نظر ڈالی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مولف نے اپنا مطلب نہایت سلیس اور پُراثر الفاظ میں ادا کیا ہے۔''(۷)

شیکسپیئر کے مشہور ڈرامے A Mid-Summer Nights Dream کو ''ساون رین کا سپنا'' کے عنوان سے ترجمہ کیا۔ ۱۹۲۲ء میں اُنھوں نے ''انار کلی'' کے عنوان سے اپنا شاہکار ڈراما کیا تحریر کیا کہ اُن کا نام ہر خاص وعام کی زبان پر آگیا۔ ''اُردو ادب کی مختصر تاریخ'' میں انور سدید نے ڈراما انار کلی کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا ہے:

''امتیاز علی تاجؔ کا ڈراما انار کلی ایک ایسے تراشیدہ فن پارے کی حیثیت رکھتا ہے جس کی فنّی آرائش میں بہت محنت صرف کی گئی تھی۔ چناں چہ اسے دورِ جدید کا نقشِ اوّل شمار کیا گیا۔ یہ ڈراما جہانگیر اور انار کلی کے فرضی معاشقے پر مبنی ہے۔ اکبرِ اعظم کا ردّ عمل، دلآرام کی سازش، مہارانی کی ممتا اور انار کلی کی قربانی اس میں ڈرامائی تاثّر اور گہرائی پیدا کرتے ہیں۔ تاجؔ نے ان سب کے جذباتی جزر و مد کو پوری شان سے کاغذ پر منتقل کیا ہے اور کش مکش کو ڈرامائی صورت دے دی ہے۔ ہر چند یہ ڈراما اسٹیج پر کامیابی سے پیش نہ کیا جا سکا، تاہم اس کی ادبی حیثیت کو ہمیشہ تسلیم کیا گیا۔''(۸)

ڈراما اپنے وقتِ تخلیق سے اب تک نہ جانے کتنی ہی بار اسٹیج پر اور فلموں میں پیش کیا جا چکا ہے۔ نصابی سطح پر پڑھانے کے علاوہ اس کی شہرت وقت اور سرحد سے ماورا ہو چکی ہے۔ ''انار کلی'' سے ایک بڑی ادبی جست لگانے والے سیّد امتیاز علی تاج نے ۱۹۲۶ء میں اپنی ادبی زندگی کا ایک اور سنگِ میل عبور کیا اور اُردو ادب کے انتہائی دلچسپ اور ناقابلِ فراموش کردار ''چچا چھکن'' کے ساتھ سامنے آئے۔ یہ کردار کس طرح تخلیق پایا، یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے۔ حکیم محمد یوسف حسن ''نیرنگِ خیال'' کے عنوان سے ایک ماہانہ پرچہ نکالتے تھے۔ اپنے مخصوص ادبی رنگ کے باعث اسے ادب نواز حلقوں میں بہت ذوق و شوق سے پڑھا جاتا تھا۔ حکیم محمد یوسف حسن پرچے میں مسلسل ایسی چیزیں شامل کرتے کہ جس سے پڑھنے والوں کے حلقے میں مسلسل اضافہ بھی ہوتا اور وہ رسالے کے مندرجات سے پوری طرح محظوظ ہوتے۔ ایک دن حکیم محمد یوسف حسن انگریزی زبان کے مصنّف Jerome K Jerome کی کتاب ''تھری من ان اے بوٹ'' کا مطالعہ کر رہے تھے۔ کہانی کا ایک کردار ''انکل بوچر'' ظریفانہ رنگ کا حامل تھا۔ حکیم محمد یوسف حسن کو یہ کہانی بہت پسند آئی اور اُنھوں نے امتیاز علی تاج سے درخواست کی کہ وہ ''نیرنگِ خیال'' کے ''عید نمبر'' کے لیے اُسے اُردو داں حلقوں میں روشناس کرانے کے لیے اُردو زبان کا پیرہن عطا کر دیں۔ امتیاز علی تاج کو بھی کہانی بہت پسند آئی، تاہم اُنھوں نے اپنی فطری ذہانت کو بروئے کار لاتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ اُس میں کچھ تبدیلی کر دی جائے۔ سو اس تبدیلی کے نتیجے میں ''چچا چھکن'' نے اُردو ادب کے میدان کا رُخ کر لیا اور اُس دن کے بعد سے مزاحیہ ادب

میں گو یا میدان اُن ہی کے ہاتھ آگیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا ''اُردو ادب میں طنز و مزاح'' میں واضح طور پر تحریر کرتے ہیں کہ ''چچا چھکّن میں ہم پہلی بار اپنے ادب کے صحیح ترین مزاحیہ کردار سے متعارف ہوتے ہیں کہ یہاں لفظی بازیگری، عملی مذاق اور مضحکہ خیز حلیہ وغیرہ کی بجائے صرف فطری ناہمواریوں سے مضحکہ خیز واقعات کو تحریک ملی ہے۔''(۹) گو یا ڈاکٹر وزیر آغا کے خیال میں ''چچا چھکّن'' اُردو ادب کا مزاحیہ ترین کردار ہے۔

۱۹۳۵ء میں امتیاز علی تاج کی شادی حجاب اسماعیل سے انجام پائی۔ حجاب حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئی تھیں۔ اُن کے والد سیّد محمد اسماعیل انتہائی باصلاحیت انسان تھے۔ نظام حیدر آباد کے فرسٹ سیکریٹری کے طور پر اعلیٰ کارِ سرکاری میں ہمہ وقت مصروف رہتے تھے۔ حجاب حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئیں۔ ۱۹۱۵ء کا سال تھا اور ہندوستان بہت سی شورشیں دیکھنے کے بعد شاید کسی اگلی شورش کا منتظر تھا۔ گو یا حجاب کا بچپن اور لڑکپن کا تمام تر زمانہ انتہائی اہم سیاسی تبدیلیوں سے عبارت تھا کہ اُن کی پیدائش کے اگلے ہی برس ہندوستان کے سیاسی اُفق پر ایک نئی سیاسی جماعت ''مسلم لیگ'' نے جنم لیا۔ اُن کے والد سیّد محمد اسماعیل انتہائی باصلاحیت انسان تھے۔ نظام حیدر آباد کے فرسٹ سیکریٹری کے طور پر اعلیٰ سرکاری کاموں میں ہمہ وقت مصروف رہتے۔ والدہ عبّاسی بیگم بھی اس عنوان سے منفرد خاتون تھیں کہ ادب و شعر سے لگاؤ میں اپنے وقت کی خواتین میں یکتا نظر آتیں۔ اُنھوں نے ایک ناول ''زہرا بیگم'' کے عنوان سے تحریر کیا، جسے ادبی حلقوں میں بے حد سراہا گیا۔ فلسفہ اُن کی دلچسپی کا ایک اور میدان تھا اور اس میں اُنھوں نے محض زبانی حد تک ہی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا، بلکہ بہت سے مضامین بھی تحریر کیے، جنھیں کچھ وقت بعد ''گلِ صحرا'' کے عنوان سے کتابی شکل دے دی گئی۔ گو یا حجاب اسماعیل کے ماں باپ دونوں ہی اپنے اپنے شعبوں میں ممتاز حیثیت کے حامل تھے۔ اُن کی تمام تعلیم و تربیت حیدر آباد دکن ہی میں ہوئی۔ معاشی طور پر آسودگی تھی، لہٰذا کم عمری میں دیکھنے والے خوابوں کو حقیقت کا رُوپ دینے کا بھی آئندہ زندگی میں خوب خوب موقع ملا۔ عربی، فارسی اور اُردو کی تعلیم تو گھر ہی پر حاصل کی گئی، تاہم سینیر کیمبرج کے امتحان میں بھی اچھی کارکردگی دکھائی۔ ۱۹۲۷ء۔۲۸ء کا سال تھا اور عمر محض بارہ یا تیرہ برس رہی ہوگی کہ زندگی کا اوّلین افسانہ ''میری ناتمام محبت'' شائع ہوا اور اُس کے چرچے ہونے لگے۔ حُسن و عشق اور

حُزن و ملال کے رنگوں سے سجے اس افسانے کو ایک نَو عمُر لڑکی نے نہ جانے کس جذبے سے تحریر کیا کہ یہی افسانہ اُس کی ابتدائی شناخت بھی بن گیا۔ ۱۹۳۵ء تک حجاب کے کئی مجموعے شائع ہو چکے تھے جن میں ''نغماتِ موت''، ''ادبِ زرّیں''، ''میری ناتمام محبت''، ''لاش اور دوسرے ہیبت ناک افسانے'' وغیرہ شامل تھے۔ اگرچہ اُن کے ارد گرد کی پوری فضا انتہائی درجہ سیاسی اور بے چینی پر مبنی تھی۔ اُس دَور کے بڑے بڑے شاعر، ادیب اور افسانہ نگار اپنے قریب ہونے والی تبدیلیوں سے متاثّر ہو کر اُن ہی مسائل و معاملات کو اپنی تخلیقات میں اُجاگر بھی کر رہے تھے، تاہم حجاب کو اپنے قلم پر اس حد تک اعتبار تھا کہ وہ سمجھتی تھیں کہ اُن کی تحریروں کو لوگ اُسی رنگ میں پسند کریں گے جسے وہ اظہار کے لیے اپناتی ہیں۔ اُسی برس اُن کی شادی اُردو کے نام وَر ادیب اور ڈراما نگار، امتیاز علی تاج سے ہوئی۔ یوں شادی کے بعد وہ حجاب امتیاز علی کے نام سے لکھنے لگیں۔ ابتدائی عمُر ہی سے اونچی اڑان کے سپنے دیکھنے والی حجاب نے شادی کے اگلے ہی برس یعنی ۱۹۳۶ء میں ایک اور اونچی اڑان اس طرح بھری کہ برّصغیر میں بہت سی روایات اور تہذیب کی بنیاد پر منفرد مانے جانے والے شہر لاہور میں واقع ناردن فلائنگ کلب سے ہوا بازی کی سند حاصل کر لی۔ یہ ایک خاتون کے لیے اُس وقت کی فضا کے حساب سے شاید ترقی کی معراج تھی۔ ہوا میں پرواز کرنے یا پائلٹ بننے کا خیال بھی یوں آیا کہ ایک دن آسمان کی وسعتوں میں محوِ پرواز عقاب کو دیکھا اور اُس کی شانِ پرواز اس قدر پسند آئی کہ ارادہ کر لیا کہ جیسے بھی ممکن ہو، فضاؤں میں پرواز ضرور کرنا چاہیے۔ یوں دل میں ٹھان لیا گیا اور ایک دن اُسے عملی جامہ بھی پہنا دیا۔ اس طرح حجاب امتیاز علی کو برطانوی ہند کی اوّلین ہوا باز خاتون ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہو گیا۔ محترمہ فاطمہ جناح ہمیشہ اس بات پر متعجب ہوتیں کہ حجاب نے یہ کیسے ممکن بنایا؟ تاہم ان سب باتوں کے باوجود بھی حجاب نے قلم سے اپنا رشتہ مضبوط بنیادوں پر استوار رکھا۔ حجاب نے موسیقی کی بھی تعلیم حاصل کی۔ انگریزی زبان و ادب اُن کو بہت متاثّر کرتا، سو اُس کا مطالعہ بھی بہت جم کر کیا۔ اُنھوں نے زندگی کے آخر تک قلم سے رشتہ قائم رکھا۔ اُن کے ناولوں، افسانوی مجموعوں اور مضامین کے دیگر مجموعوں میں ''خلوت کی انجمن''، ''اندھیرا خواب''، ''وہ بہاریں یہ خزائیں''، ''پاگل خانہ''، ''سیّاح عورت''، ''کونٹ الیاس کی موت اور دوسرے ہیبت ناک افسانے''، ''ممی

خانہ''، ''کالی حویلی اور دوسری خوفناک کہانیاں''، ''تحفے اور شگوفے''اور ''لیل ونہار (ڈائری)'' وغیرہ شامل ہیں۔ ''موم بتّی کے سامنے''آپ بیتی ہے اور اس منفرد نام کی وجہ یہ ہے کہ اُنھوں نے ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کا احوال اس طرح قلم بند کیا ہے کہ جنگ کے دوران رات میں بلیک آؤٹ ہوتا تھا اور حجاب موم بتّی کی مدّھم اور لرزتی روشنی میں تخلیق سے اپنا مضبوط رشتہ اس طرح استوار کرتیں کہ قلم، کاغذ، احساس، تجربہ، حافظہ سب اسپِ بے لگام کی طرح رواں ہو جاتے۔ ناول ''اندھیرا خواب''، سگمنڈ فرائڈ کی تحریروں کے گہرے مطالعے کا نتیجہ ہے کہ جس میں ذہن کی نفسیاتی تہوں کو جاننے اور کھولنے کی کوشش ہے۔ ''پاگل خانہ''ایک اور فکر انگیز اور اہم ناول ہے کہ جس میں ایٹم بموں اور کیمیائی ہتھیاروں سے ہونے والی تباہی کے باعث کہ جس کا اوّل وآخر ذمے دار انسان ہے، دنیا کو دارالامن کے بجائے ایک پاگل خانے سے تشبیہ دی جارہی ہے۔ تراجم، بچّوں کے لیے تحریری سرمایہ اور ''تہذیبِ نسواں'' کی ادارت الگ میدان رہے۔ نیلم فرزانہ نے حجاب کی تخلیقی اُڑان کے بارے میں لکھا ہے:

> ''مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ حجاب کا موضوع حُسن وعشق ہے۔ اُنھوں نے اس موضوع کو پیش کرنے کے لیے ایک حسین کائنات تخلیق کی ہے جو اُن کے خلاقِ تخیل کا کرشمہ ہے۔''(۱۰)

شوکت تھانوی کے امتیاز علی تاج سے گہرے مراسم تھے۔ اسی نسبت سے وہ امتیاز علی تاج کے گھر بھی آیا جایا کرتے۔ کسی وقت میں حجاب امتیاز علی پریشانی میں مبتلا ہوئیں تو امتیاز علی تاج نے شوکت تھانوی کو خاص طور پر گھر مدعو کیا، جہاں اُنھوں نے اپنی فطری بذلہ سنجی اور ظرافتِ طبع سے حجاب امتیاز علی کو خوب محظوظ کیا۔ حجاب مارچ ۱۹۹۹ء میں لاہور میں انتقال کر گئیں۔

امتیاز علی تاج نے پاکستان کے قیام کے بعد ریڈیو پاکستان لاہور سے ''پاکستان ہمارا ہے'' کے عنوان سے یومیہ فیچر بھی پیش کیا۔ اسے سامعین میں اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی کہ وہ کئی برس تک ریڈیو سے نشر ہوتا رہا۔ اسی زمانے میں اُنھوں نے ریڈیو ڈراموں کے علاوہ فلموں کے لیے بھی کہانیاں لکھیں۔ ''قرطبہ کا

قاضی'' کو بھی بے حد مقبولیت ملی اور یہ ڈراما نصاب میں شامل کیا گیا۔ امتیاز علی تاج ''نیاز مندانِ لاہور'' کے رکن بھی تھے۔ متذکرہ حلقہ اس سوچ کا حامل تھا کہ ادب میں جدید تصوّرات اور اسالیب کو روشناس کرایا جائے۔ مولانا عبدالمجید سالک اس کے روحِ رواں تھے اور دیگر ارکان میں پطرس بخاری، ایم ڈی تاثیر، چراغ حسن حسرت، مولانا غلام رسول مہر، صوفی غلام مصطفیٰ تبسّم وغیرہ شامل تھے۔ امتیاز علی تاج کو تھیٹر سے اس حد تک دلچسپی تھی کہ اُس کے لیے لکھنے اور ہدایات دینے کے ساتھ بطور اداکار بھی کام کیا۔ علم وادب کے فروغ کے لیے قائم ہونے والے ادارے ''مجلس'' سے بھی بحیثیت صدر طویل وابستگی رہی۔ اُنھیں ہمہ وقت متحرّک اور فعال رہنے کا گر آتا تھا، تاہم ''کارِ ہمہ وقتی'' سر بسر انفرادیت پر مبنی ہوتی۔ ادب اور آرٹ کی دیوانگی میں مبتلا رہنے والی ایک بے چین روح، کچھ کر دکھانے کی دُھن میں مصروف ایک بیدار دماغ، سماج کو بہتر طور پر کچھ دیے جانے کی لگن میں منہمک ایک شاداب دماغ کو ۱۹ اپریل ۱۹۷۰ء کو نامعلوم قاتلوں نے رات کی تاریکی میں سماج کو مزید کچھ دیے جانے کے خواب دیکھنے والے امتیاز علی تاج کو ہمیشہ کی نیند سُلا دیا۔ اُن کی تصانیف میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ ''اُردو کا کلاسیکی ادب''، ''ریل کہانیاں''، ''مجلسِ ترقیِ ادب''۔

امتیاز علی تاج اور حجاب امتیاز علی کی بیٹی یاسمین طاہر ہیں۔ یاسمین کی وجہِ شہرت ریڈیو رہا۔ اُنھوں نے ریڈیو پر رسمی انٹرویوز کو ترک کر کے غیر رسمی انداز کی بنیاد ڈالی اور ریڈیو سامعین کو حقیقی معنوں میں محسوس ہونے لگا کہ ریڈیو کے اندازِ کار میں ایک خوش گوار تبدیلی آئی ہے۔ اُس زمانے میں ریڈیو کا ایک مقبول پروگرام ''سات رنگ'' تھا، جسے پروگرام کے مرد اور عورت میزبان مل کر چلاتے، تاہم فیصلہ ہوا کہ اسے تنہا آواز میں پیش کیا جائے اور یوں یاسمین طاہر نے اپنی خوب صورت صداکاری اور لب و لہجے کے کمال اتار چڑھاؤ کے ساتھ اس طرح پیش کیا کہ سامعین میں بے حد مقبولیت کا حامل ہو گیا۔ یہاں تک ہوا کہ سلیم گیلانی نے ایک تقریب میں یاسمین طاہر سے کہا کہ آپ نے کمپیرنگ کے معنی ہی بدل دیے۔ یاسمین کی شادی نعیم طاہر کے ساتھ ہوئی۔ نعیم طاہر شوبز کی دنیا کا ایک مستند نام ہے۔ اُن کی والدہ ڈاکٹر اور والد ماہرِ تعلیم اور دانشور تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ اُنھوں نے انگریزوں کے خلاف چلائی جانے والی سول نافرمانی کی تحریک میں بھی حصّہ لیا تھا۔ نعیم طاہر امر تسر،

پنجاب کے علاقے چھان گلی میں ۱۹۴۷ء میں پیدا ہوئے۔ یہ مقام جلیانوالہ باغ سے ایک سے ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ نعیم طاہر کو محض شوبز سے وابستہ فرد کہنا کافی نہیں کہ اُن کا شمار اہلِ دانش میں ہوتا ہے۔ اُردو اور انگریزی میں کتابیں بھی تحریر کر چکے ہیں۔ مختلف انگریزی اخبارات کے لیے کالم بھی تحریر کرتے ہیں۔ ڈراما، تھیٹر، فلم، ہدایت کاری کے شعبے میں نعیم طاہر نے اپنی شناخت قائم کی ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے پڑھے ہوئے نعیم طاہر کو آرٹ سے دلچسپی رہی۔ اب عالم یہ ہوا کہ کبھی ریڈیو تو کبھی تھیٹر اور کبھی فلم کی باتیں۔ صفدر میر کی صحبت نصیب ہوئی اور یوں تھیٹر کی دنیا سامنے آگئی۔ فضل کمال سے صاحبِ کمال سے بھی راہ ورسم ہوئی۔ یونیورسٹی میگزین کے لیے نہ صرف مضمون لکھا بلکہ اسے پڑھا بھی۔ مزاحیہ انداز میں لکھے گئے اس مضمون پر اُن کے لیے ریڈیو کے دروازے کھل گئے۔ رفیع پیر اور امتیاز علی تاج کی رہنمائی بھی نصیب ہوئی۔ یہیں اسکرپٹ کی سوجھ بوجھ پیدا ہوئی۔ امتیاز علی تاج کے لکھے ایک ڈرامے میں نعیم طاہر اور یاسمین آمنے سامنے تھے اور یہیں سے دونوں کی ایک دوسرے کے لیے پسندیدگی کے احساسات بیدار ہوئے، جس نے آگے چل کر دونوں کو شادی کے بندھن میں باندھ دیا۔ شادی کے فوری بعد نعیم طاہر نے بیرونِ ملک یونی ورسٹی سے ڈرامے کی تکنیک کے بارے میں سند حاصل کی۔ قبل ازیں وہ مقابلے کا امتحان بھی پاس کر چکے تھے۔ ان کی اولاد میں علی طاہر اور فاران طاہر نے شوبز سے وابستگی اختیار کی ہے۔ امتیاز علی تاج کے پوتے علی طاہر نے ٹی وی کے بہت سے ڈراموں میں نہ صرف یہ کہ کام کیا ہے بلکہ اپنے کام کے باعث پہچان بھی رکھتے ہیں۔ ڈراما انڈسٹری میں اُن کی وابستگی کو لگ بھگ سولہ سترہ برس ہونے کو آرہے ہیں۔ پی ٹی وی سے نوّے کے عشرے کے اختتام کام کا آغاز کیا۔ اُن کے چند ڈراموں میں ''غرور''، ''تین بٹا تین''، ''رنجش''، ''جنوں میں جتنی بھی گزری''، ''مجھے جینے دو''، ''محبت صبح کا ستارہ ہے''، ''تارِ عنکبوت''، ''التجا'' شامل ہیں۔ اُنھوں نے اسٹیج اور فلم میں بھی کام کیا ہے۔ علی طاہر ڈائریکشن میں بھی بہت دلچسپی لیتے ہیں۔ ''رنگ''، ''سمجھوتا ایکسپریس''، ''موہنی مینشن کی سینڈریلائیں'' اور ''تاج کلاسکس'' کے عنوان سے اپنے دادا کی تحریروں کو ڈرامائی تشکیل دی ہے۔ اہلیہ وجیہہ طاہر ہیں۔ ان کی ایک بیٹی بھی ہے۔ علی طاہر کے ایک بھائی مہران طاہر اور ایک فاران طاہر ہیں۔ فاران بھی

اداکاری کے شعبے سے وابستہ ہیں، تاہم وہ ہالی وڈ فلموں کو ترجیح دیتے ہیں اور اُن کی شناخت کا ذریعہ بھی اُن کی وہی فلمیں ہیں جو اُنھوں نے ہالی وڈ اسکرین پر کام کر کے بنائی ہے۔ سیّد ممتاز علی کی علمی و ادبی روشن خیالی سے شروع ہونے والا سفر نسل در نسل آج بھی جاری ہے اور یوں یہ خانوادہ علم و ادب اور آرٹ کی دنیا میں ثابت قدمی سے آگے بڑھ رہا ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ ڈاکٹر وزیر آغا، اردو ادب میں طنز و مزاح،(نئی دہلی: اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، جولائی ۱۹۷۸ء)، ص ۲۳: ۲۴۔

۲۔ ڈاکٹر رؤف پاریکھ، اُردو نثر میں مزاح نگاری کا سیاسی اور سماجی پس منظر،(کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۹۶ء)، ص ۳۸۔

۳۔ سیّد حیدر عبّاس رضوی، اُردو ڈراما اور انار کلی،(بھوپال: بھوپال بک ہاؤس، ۱۹۷۷ء)، ص ۹۴۔

۴۔ مولوی سیّد ممتاز علی، شیخ حسن یعنی روحانیات کے متعلق ایک دلچسپ سرگزشت،(ایک مغربی سیّاح کی تصنیف سے ترجمہ)،(لاہور: دار الاشاعت پنجاب، ۱۹۲۰ء)، ص ۱۔

۵۔ امداد صابری، تاریخ صحافت (اردو)، جلد سویم،(کوچہ راجھستان: مولانا شاہ اسرار الحق، ۱۹۶۳ء)، ص ۲۶۷۔

۶۔ ڈاکٹر ایس کے جبیں، اُردو کی خواتین ناول نگار،(پٹنہ: ارم پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۹ء)، ص ۷۰۔

۷۔ سیّد امتیاز علی تاج، بھارت سپوت یعنی مہاتما گاندھی کی سوانح عمری،(لاہور: پنجاب اکنامیکل پریس، ۱۹۱۹ء)۔

۸۔ ڈاکٹر انور سدید، اُردو ادب کی مختصر تاریخ،(اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۱ء)، ص ۳۰۴۔

۹۔ وزیر آغا، اردو ادب میں طنز و مزاح،(علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۰ء)، ص ۲۸۶۔

۱۰۔ نیلم فرزانہ، اردو ادب کی اہم خواتین ناول نگار،(علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۲ء)، ص ۷۱: ۷۲۔